حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے

زمانہ قدیم کا انسان گاؤں دیہاتوں میں فطرت کے اندر جیتا تھا۔ اس کے ہر طرف پرندے چہچہاتے تھے۔ رنگ برنگے پھول کھلے ہوتے تھے۔ دور دور تک فصلیں لہلہاتیں تھیں۔ بارش ہوتی تو دور تک پھیلی زمین گل وگلزار ہو جاتی۔ جگہ جگہ سبزہ زار اور گلزار وجود میں آ جاتے تھے۔ رات ہوتی یہ مناظر سمٹ جاتے مگر تاروں بھرا جگمگاتا آسمان انسان کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا۔ چاندنی راتیں ہوتیں تو آسمان چاند سے اور زمین چاندنی سے سج جاتی۔ پھر سورج تو ہر صبح وشام اپنے جلوے افق پر بکھیرتا رہتا اور نگاہیں انھیں سمیٹتی رہتیں تھیں۔

فطرت آج بھی وہی ہے، مگر اب کائنات کے بارے میں ہمارا علم بہت بڑھ چکا ہے۔ کائنات اور خود انسان کے بارے میں جو حیرت انگیز معلومات سامنے آئیں ہیں ان کا مطالعہ انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہ معلومات اتنی حیرت انگیز اور تفصیلی ہیں کہ سارے درخت قلم اور سمندر سیاہی بن جائیں تب بھی یہ حیرت انگیز تفصیلات ختم نہ ہوں۔

فطرت کا مطالعہ اور سائنس کا علم ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ آرٹس اور سائنس کے ہر شعبے کے شاہکار موجود ہیں۔ مصوری، موسیقی، انجینئرنگ، آرکیٹکچر، میتھس غرض ہر شعبہ علم کا ماہر جو آخری چیز تخلیق کر سکتا ہے، خدا اس سے کہیں بڑھ کر اعلیٰ چیزیں پہلے ہی بنا چکا ہے۔ ایک بندہ مومن جب یہ دیکھتا ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ کتنا ہی قادر الکلام کیوں نہ ہو، اسے لگتا ہے ہر انسانی بیان خالق کائنات کی صفات وکمالات کو بیان کرنے میں آخری درجہ میں عاجز ہے۔ اپنی بیکسی پر اس کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور وہ یہ کہہ کر چپ ہو جاتا ہے۔

کہہ دے گی سب کچھ ان کے ثنا خواں کی خامشی
چپ ہو رہا ہے کہہ کہ میں کیا کیا کہوں تجھے

پالتو مرغی کا شکار

کسی ستم ظریف نے میاں بیوی کے رشتے میں مرد کی محبت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک شوہر کا اپنی بیوی سے اظہار محبت کرنا ایسا ہی ہے جیسے پالتو مرغی کا شکار کھیلنا۔ یہ بات مزاحیہ انداز میں مردوں کی ایک بڑی کمزوری کا بیان ہے۔ وہ کمزوری یہ ہے کہ میاں بیوی کے رشتے میں بندھنے کے بعد بحیثیت عورت بیوی کی کشش کم ہو جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت دفعہ اس کی ذمہ داری خواتین کے سر بھی ہوتی ہے جو بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی شوہر اور خود اپنی ذات سے بھی بے پروا ہو جاتی ہیں۔ گھر میں ماں آجاتی ہے اور بیوی رخصت ہو جاتی ہے۔ تاہم ایسا نہ ہو تب بھی مرد فطری طور پر بیوی میں بحیثیت عورت اس طرح دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ چیز اکثر میاں بیوی کے رشتے میں ناچاقی اور بعض اوقات گھر کی خرابی کا سبب بن جاتی ہے۔

ایسے میں یہ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا تکمیل لذت کے نہیں بلکہ تعارف لذت کے اصول پر بنائی ہے۔ اس دنیا کی ہر نعمت جیسے ہی دسترس میں آتی ہے، اپنی کشش کھو دیتی ہے۔ یہ بظاہر اس دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے لیکن اس واقعے کا اصل مقصد انسان کو یہ بتانا ہے کہ یہ دنیا سب کچھ پا لینے کی نہیں بلکہ اس جنت کے تعارف کی جگہ ہے جس کا ہر عیش دائمی اور ہر لذت ابدی ہوگی۔

یہ حقیقت جاننے کے بعد انسان کی اصل توجہ اس امتحان کی طرف رہے گی جس میں کامیابی کا نتیجہ یہ لافانی جنت ہوگی۔ ایسا انسان اپنی بیوی کی ڈھلتی جوانی کو واپس لانے یا کسی نئی عورت میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنے بیوی سے جیسی کہ وہ ہے، محبت کرے گا۔ کیونکہ یہ محبت ہی گھر میں ایک پاکیزہ ماحول پیدا کرے گی۔ یہی پاکیزگی اس کو اور اس کے خاندان کو دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب و کامران کرے گی۔

تعمیری کام اور تخریبی کام

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے جو دنیا بنائی ہے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک تعمیری دنیا ہے۔اس دنیا میں پہاڑ ہیں جو اگر ہلنے لگیں تو آبادیاں ختم ہوجائیں، مگر وہ صدیوں اپنی جگہ کھڑے رہ کر انسانوں کو موسم اور جنگلات عطا کرتے ہیں۔اس دنیا میں سمندر ہیں جو اگر ابل پڑیں تو شہروں کو ساتھ بہالے جائیں، مگراس کے بجائے وہ انسانوں کے سفر کے لیے اپنا سینہ مسخر کردیتے ہیں۔اس دنیا میں ہوا ہے جو بے قابو ہوجائے تو زندگی کی ہر رمق کو اڑا کر رکھ دے گی، مگر وہ زندگی کو تنفس جیسی لازمی چیز کی فراہمی سے آگے نہیں بڑھتی۔

خدا کی دنیا کا یہ مزاج اس وجہ سے بنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کچھ افراد کے لیے نہیں بلکہ تمام مخلوق کے لیے بنائی ہے۔تمام مخلوق کا فائدہ صرف تعمیری کام سے ہوتا ہے۔جبکہ تخریبی کام سے کچھ ہی لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے۔مثلاً زلزلہ، طوفان اور آندھی آنے سے بھی کچھ کاروباری لوگوں کی دولت اور بڑھ جاتی ہے، مگر بیشتر لوگوں کا بہت نقصان ہوجاتا ہے۔

انسانی معاشروں کا معاملہ بھی اس سے کچھ جدا نہیں۔ یہاں بھی تعمیری کام سے سب لوگوں کا بھلا ہوتا ہے لیکن تخریبی کام سے کچھ لوگوں کا بھلا اور باقی کا نقصان ہوتا ہے۔اس کی ایک بڑی مثال جنگ ہے۔ جنگ انسانی معاشروں کو برباد کردینے والی شے ہے۔ یہ بچوں کو یتیم، عورتوں کو بیوہ اور آباد گھروں کو برباد کردینے والی شے ہے۔مگر کچھ لوگ جنگوں میں خوب دولت اور شہرت کماتے ہیں۔اس کے برعکس تعلیم ایک تعمیری عمل ہے۔اس سے تمام لوگوں کا فائدہ ہوتا ہے۔

اگر ہمیں اپنے معاشرے کو بہتر بنانا ہے تو ہمیں تعمیری کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی اور تخریبی سوچ کی حوصلہ شکنی کرنا ہوگی۔ ہم ایسا نہیں کریں گے تو کچھ لوگوں کو بہت فائدہ ہوگا، مگر عام آدمی مسلسل نقصان اٹھاتا رہے گا۔

یہود اور ہمارے ٹاک شو

مناظرہ ایک ایسا فن ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کو غلط ثابت کرنے کے لیے بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ مناظرے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ مخالف فریق کی مضبوط ترین دلیلوں کو بے معنی اعتراضات سے چٹکیوں میں اڑا دیا جائے۔ اس کی ایک نمایاں ترین مثال یہ ہے کہ قرآن مجید نے جب یہ چیلنج دیا کہ اس قرآن جیسی ایک صورت بھی بنا لاؤ تو ہر گردن اس اعتراف میں جھک گئی کہ اس جیسا اعلیٰ کلام تخلیق کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

مگر یہود اس ناقابل شکست دلیل کا ایسا جواب لائے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہوں نے چیلنج سے فرار اختیار کرتے ہوئے الٹا قرآن پر کمال عیاری کے ساتھ یہ اعتراض کر دیا کہ جس کلام میں مچھروں اور مکھیوں جیسی گھٹیا مخلوق کا ذکر ہو وہ اعلیٰ کیسے ہوسکتا ہے، گھٹیا تمثیل کوئی اعلیٰ مفہوم تو کیا کوئی بامعنی مفہوم ہی بیان نہیں کرسکتی۔ اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مناظرانہ سوچ کیا ہوتی ہے اور کس طرح الزامی طریقہ کار اور لفاظی پر مبنی اعتراض سے ناقابل تردید چیلنج کو بھی بظاہر ملیا میٹ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے کچھ اور ہو نہ ہو اپنے لوگ ضرور مطمئن ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے آج کل کے ٹی وی شوز، پرنٹ اور سوشل میڈیا پر ہونے والے بحث و مناظرے میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ ان مباحثوں میں اسی طریقہ واردات کو استعمال کر کے ہر غلطی کا بھرپور دفاع کیا جاتا ہے۔ جیسے ہی کسی اخلاقی غلطی کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے فوراً غیر متعلقہ نکتہ اٹھا کر اپنے جرم سے توجہ ہٹانے کے لیے ملبہ کسی اور پر گرا دیا جاتا ہے۔ کسی کرپشن، دھاندلی، یا زیادتی کا ذکر کیا جاتا ہے اعتراف کے بجائے فوراً ایک جوابی الزام لگا دیا جاتا ہے۔ مگر ایسا کرنے والے ہوشیار لوگوں کو شاید یاد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سطح پر اترنے والے یہود کے الزام کا جواب دینے کے بجائے ان کی جڑ کاٹنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کاش لوگ یہ بات سمجھ لیں۔

حاجی صاحب کی رہنمائی

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (1818-1899) انیسویں صدی کے مشہور صوفی بزرگ ہیں۔ ہندوستان میں دیوبندی مکتب فکر کی علمی، دعوتی اور متصوفانہ روایت جتنی کچھ بھی ہے، وہ بلاواسطہ یا بالواسطہ حاجی صاحب ہی سے پھوٹی ہے۔ان کے وابستگان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا یعقوب احمد نانوتوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا محمود الحسن مدنی جیسے دیوبندی اکابرین شامل ہیں۔

بیسویں صدی میں رونما ہونے والے انتہائی شدید دیوبندی بریلوی اختلافات کے باوجود جن میں مندرجہ بالا بعض دیوبندی اکابرین پر کفر اور پورے دیوبندی مکتب فکر پر گمراہی کے فتوے بھی بریلوی اہل علم کی طرف سے لگائے گئے، بریلوی حضرات کے ہاں حاجی صاحب کو بالعموم احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔بعض روایات کے مطابق پیر مہر علی شاہ جیسے بڑے بریلوی بزرگ بھی حاجی صاحب سے فیض یافتہ تھے اور انھی کی ہدایت پر حجاز مقدس سے واپس ہندوستان لوٹے تھے۔

حاجی صاحب کی ایک تصنیف ''فیصلہ ہفت مسئلہ'' ان سات اہم مگر فروعی مسائل کے بارے میں ایک رہنما تحریر ہے جنھوں نے تقریباً ایک صدی سے برصغیر میں زبردست مسلکی انتشار و اختلاف پیدا کر رکھا ہے۔ان سات مسائل میں حاجی صاحب کی رائے ایک الگ موضوع ہے، مگر اس تحریر میں انھوں نے ایک ایسی بات بھی لکھی ہے جو ہر قسم کے اختلافات کو ختم نہ بھی کرے تب بھی ایک ایسے دائرے میں لے آتی ہے جہاں یہ باعث فساد نہیں رہتے۔

وہ اس تصنیف میں پہلے مسئلے یعنی مولود شریف کی بحث کے آخر میں لکھتے ہیں:

''عوام کو چاہیے کہ جس عالم کو متدین (دین دار) اور محقق سمجھیں اس کی تحقیق پر عمل کریں اور

دوسرے فریق کے لوگوں سے تعارض نہ کریں۔ خصوصاً دوسرے فریق کے علما کی شان میں گستاخی کرنا، چھوٹا منہ اور بڑی بات کا مصداق ہے۔ غیبت اور حسد سے اعمال حسنہ ضایع ہوتے ہیں۔ ان امور سے پرہیز کریں اور تعصب و عداوت سے بچیں۔ اور ایسے مضامین کی کتابیں اور رسالے مطالعہ نہ کیا کریں کہ یہ علما کا کام ہے۔ عوام کو علما سے بدگمانی سے اور مسائل میں شبہ پیدا ہوتا ہے۔''

بلا شبہ یہ ایک انتہائی سچی بات ہے۔ ہمارا دین ایک محفوظ دین ہے۔ ہمارے دین کے بنیادی عقائد اور اعمال جتنے کچھ اللہ کے ہاں جوابدہی کا باعث ہوں گے وہ سب کے سب خاتم الانبیا علیہ السلام خود اپنی تعلیمات میں واضح طور پر بیان کر کے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود علم کی دنیا میں جزئی اور فروعی چیزوں پر اہل علم میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اہل علم میں اختلاف ہونا ایک فطری چیز ہے۔ وہ پہلے بھی ہوا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ اس سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مسئلہ تب ہوتا ہے جب سطحی علم کے کچھ لوگ اور عوام الناس علمی معاملات میں کود پڑتے ہیں۔ ایسے جہلا پورے اعتماد سے تنقیدیں لکھتے ہیں، پروپیگنڈے کرتے ہیں، الزام و بہتان کے تیر برساتے ہیں، کفر و ضلالت کے فیصلے کرتے ہیں حتیٰ کہ گالیوں اور بے ہودہ کلمات سے ہر اس شخص کو نوازتے ہیں جو ان کے نقطہ نظر سے مختلف رائے رکھتا ہو۔ یہ سب کچھ کرتے ہوئے وہ علم و اخلاق کے ہر مسلمہ ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان کا دل حسد و نفرت سے بھرا ہوتا ہے۔ ان کی زبان غیبت سے آلودہ ہوتی ہے۔ ان کا ذہن الزام و بہتان کی فیکٹری بن جاتا ہے، ان کا قلم جھوٹ اگلتا ہے۔ مگر حال یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں دین حق کے ترجمان اور اسلام کی مدافعت کا نعرہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی وہ صورتحال ہے جس نے آج ہمارے ہاں علمی و ذوقی اختلافات کو فرقہ وارانہ تعصّبات میں بدل دیا ہے۔

ایسے میں حاجی صاحب کی رہنمائی شاید وہ سب سے اہم چیز ہے جس کی آج دین کے نام پر کھڑے لوگوں کو سب سے بڑھ کر ضرورت ہے۔

قرآن کی تسلی کس کے لیے؟

قرآن مجید دنیا کے لیے ابدی ہدایت اور رہنمائی کی کتاب ہے۔ تاہم اس کتاب میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کے متعلق ایک طالب علم کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ انھیں ابدی ہدایت کی ایک کتاب کا حصہ بنانا ضروری نہیں تھا۔ مثال کے طور پر کفار کے کفر و عناد اور ان کی بدگوئی اور بدکلامی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و تسلی کی آیات کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید جیسی کتاب میں ان کی کیا ضرورت ہے؟

یہ تسلی قرآنی وحی کے بجائے براہ راست کلام کر کے بھی دی جاسکتی تھی۔ کسی کو تسلی دینا یا صبر کی تلقین کرنا ایک ذاتی نوعیت کا مکالمہ ہوتا ہے جسے ایک عمومی کلام کا حصہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر اس دور کے حالات کی وجہ سے یہ کر بھی دیا گیا تھا تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبے کے بعد ان کی تلاوت کو منسوخ کر دیا جاتا اور انھیں حتمی طور پر قرآن مجید کا حصہ نہ بنایا جاتا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا اور اب اس نوعیت کی آیات قیامت تک قرآن مجید کی ابدی رہنمائی کا حصہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد ان چیزوں میں کس کے لیے رہنمائی ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ منصب نبوت کا خاتمہ ہو چکا ہے، مگر کار نبوت یعنی دعوت کا خاتمہ نہیں ہوا۔ دعوت دین کا عمل قیامت تک جاری و ساری رہنا ہے۔ یہ دعوت جب بھی اپنی خالص اور بے آمیز شکل میں دی جائے گی، اس کا امکان ہے کہ مفاد و تعصّبات کے مارے کچھ لوگ عناد اور بدگوئی کے اسی کردار کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے جو کفار مکہ کا خاصہ تھا۔ ایسے میں دعوت دینے والے کسی بھی شخص کے لیے سب سے بڑا سرمایہ صبر و تسلی کی یہ آیات ہیں۔ دعوت دین کا کام کرنے والے انبیا علیہم السلام کے قدموں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہوتے، مگر بہرحال کام انھی کا کر رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ آیات انھیں حوصلہ دیتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم جیسی اعلیٰ ہستی کو اس راہ میں الزام و بہتان، جھوٹ و دشنام، ظلم و مخالفت کے یہ ظلم سہنے پڑے تو ان کی کیا حیثیت ہے۔ انھیں بھی بہت کم ہی سہی لیکن اس راہ کی سختیاں جھیلنی پڑیں گی۔ اور انھیں اسی طرح استقامت کے ساتھ توحید و اخرت اور ایمان و اخلاق کی وہ دعوت دیتے رہنا ہے جو انبیا کی اصل دعوت ہے۔

یہاں ایک سوال مسلمانوں کی تاریخ سے یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس امت میں ہر دور میں مصلحین پیدا ہوتے رہے اور اس راہ میں پیش آنے والی سختیوں کو جھیلتے رہے۔ مگر ہر دور میں ان کے مخالفین بھی مسلمان تھے اور بعض حالات میں اپنے آپ کو اصل مسلمان اور اصلاح کے لیے کھڑے ہونے والوں کو منحرفین سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر مسلمان کے طور پر ابتدائی زمانے میں اس کی ایک مثال امام اعظم امام ابوحنیفہ ہیں یا وسطی دور میں اس کی مثال امام ابن تیمیہ ہے یا دور حاضر میں اس کی ایک مثال خود ہمارے خطے میں مولانا مودودی کی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے مخالفین ان پر تنقید بھی کرتے ہیں اور ساتھ میں ان کی گمراہی کے دلائل بھی دیتے ہیں۔ ایسے میں قرآن مجید کی ایسی آیات سے تسلی حاصل کرنے کے اصل حقدار کون ہیں۔ مصلحین یا ان پر تنقید کرنے والے لوگ جو خود کو اصلی اور مخلص مسلمان سمجھتے ہیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ علمی اختلاف کرتے ہوئے اخلاقی حدود کو پامال کر جائیں وہ کسی طور ان آیات کی تسلی کے حقدار نہیں۔ کسی شخص کی علمی غلطی کو اس کے اخلاص کی بنا پر بعض احادیث کے مطابق معاف کر دیا جائے گا۔ لیکن کسی کے اخلاص کی بنا پر اس کے اخلاقی جرائم کو کسی صورت معاف نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ اخلاقی جرائم اس کے اخلاص کو مشکوک بنا کر جہنم میں داخلے کا سبب بن جائیں گے۔ دین اخلاق کی دعوت دیتا ہے۔ اخلاقی اصولوں کی خلاف ورزی کر کے دین کی دعوت نہیں دی جاسکتی، ایسا کرنا مسخرہ پن ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کے دین کو تمسخر کا موضوع بنانے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔

دور قدیم اور دور جدید

انسانوں کی فکری تاریخ کو تین نمایاں حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ماقبل از جدیدیت یا پری ماڈرن ازم (Pre Modernism) کا ہے۔ہم قارئین کی سہولت کے لیے اسے زمانہ قدیم کا نام دیدیتے ہیں۔ زمانی اعتبار سے یہ ابتدا سے لے کر سترہویں کے وسط تک کا دور ہے۔ اس دور کی اصل خصوصیت یہ تھی کہ اس دور میں مذہب انسانی زندگی کا مرکزی خیال تھا۔ مذہب کی اساس وحی ہے۔ لیکن تاریخ میں بہت کم ایسا ہوا کہ انسان وحی کو محفوظ کر سکے ہوں۔ چنانچہ جیسے ہی انبیائے کرام دنیا سے رخصت ہوتے، وحی میں تحریف ہو جاتی۔ جس کے بعد توہم پرسی اور تخیلات اور انسانی اضافے مذہب کے نام پر لوگوں میں رائج ہو جاتے ہیں۔

اس صورتحال سے ایک استثنا خاتم النبیین علیہ السلام اور ان کے صحابہ کرام کا زمانہ ہے جب وحی کی حفاظت کا خدائی اہتمام کر دیا گیا۔ تاہم مجموعی طور پر چونکہ اس دور میں ہر طرف توہم پرستی ہی کا دور دورہ تھا، اس لیے جیسے جیسے مسلمانوں کا فکری زوال بڑھا خود مسلم معاشرے توہم پرستی اور وحی سے عاری دینداری میں مبتلا ہو گئے۔ یوں اصل صورتحال میں کوئی بنیادی فرق نہیں آیا۔

پری موڈرن ازم میں چونکہ مذہب بنیادی قوت تھا اس لیے فطری طور پر مذہبی طبقات کو بہت طاقت حاصل تھی۔ اس کی نمایاں ترین مثالیں مسیحیت میں چرچ کا ادارہ اور ہندومت میں برہمن کا کردار ہے۔ سیاسی نظام زیادہ تر بادشاہت تھا، مگر بادشاہ بھی یعنی مصری حکمرانوں کی طرح خدا کے مظہر (god-kings) کی طرح حکومت کرتے یا مذہبی طبقات کو خوش کر کے خود کو سیاسی معاملات تک محدود رکھتے تھے۔

دور جدید کی آمد پر یہ صورتحال تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔ توہم کی جگہ عقلیت نے لے لی۔ اہل مذہب کی جگہ اہل دانش رہنما بن گئے۔ بادشاہت کی جگہ جمہوریت رائج ہوگئی۔ اس دور میں

خدا، مذہب، وحی اور آخرت جیسے تصورات کو ماضی کا بے فائدہ ورثہ سمجھ کر ترک کر دیا گیا۔ سائنسی ترقی نے انسانی دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔ کائناتی طاقتیں جو اس سے قبل عبادت کا موضوع تھیں، انسان کی خدمت کے لیے مسخر کر لی گئیں۔ انسانی معاشرے سماجی علوم کی بنیاد پر ایک نئے قالب میں ڈھل گئے۔ فرد کی آزادی دورِ جدید کا سب سے بڑا خیر قرار پائی۔ غرض صنعتی دور کی ترقی اور اس کے تقاضوں نے زراعتی دور کے افکار، اقدار، روایات سب کو بدل کر رکھ دیا۔

دورِ جدید کا ظہور یورپ میں ہوا تھا۔ تاہم نئی طاقت کے نشے میں سرشار یورپی اقوام نے دو ایسے کام کر ڈالے جن سے دورِ جدید کی فکری اساسات پر انتہائی بنیادی سوالات پیدا ہو گئے۔ پہلا سرمایہ دارانہ نظام کا وہ ظالمانہ فروغ تھا جس نے ارتکازِ دولت کے ذریعے سے خود یورپ کے معاشروں میں عام انسان کی زندگی جہنم بنا دی اور دوسرا بیسویں صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگیں جن میں کروڑوں لوگ ہلاک ہوئے۔ ان واقعات نے عقلیت پر مبنی جدید فکر کی افادیت پر سوالات پیدا کر دیے۔ اس پر مستزاد بیسویں صدی کی ابتداء کی وہ سائنسی دریافتیں تھیں جنھوں نے اس خیال کی نفی کر دی کہ انسان سائنس کے ذریعے سے کائناتی حقائق تک مکمل رسائی کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یوں مادی نظامِ فکر کی سائنسی اساسات پر ایک کاری ضرب لگی جس کے نتیجے میں اس کا اعتماد مجروح ہو گیا۔

چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر سے پوسٹ ماڈرن ازم کا فلسفہ وجود میں آیا جس نے علم اور عقلیت کے بجائے جذبات اور انسانیت کی بات کی اور قطعیت کے بجائے اضافیت، اور تحکم کے بجائے انفرادیت کو اپنا نعرہ بنایا۔ ان چیزوں کے نتیجے میں انسانی معاشروں میں مذہب کی اہمیت کو دوبارہ تسلیم کر لیا گیا۔ امن اور بقائے باہمی کی اہمیت نمایاں ہوئی۔ تاہم جس طرح ماڈرن ازم نے زمانہ قدیم کے تمام اہم تصورات کو بدل کر انسانی معاشروں کو مکمل طور پر

تبدیل کیا تھا پوسٹ ماڈرن ازم کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ یہ ایک ردعمل ہے جو ماڈرن ازم کی بعض کمزوریوں اور خرابیوں کو نمایاں کرتا ہے۔اسی لیے چند تبدیلیوں کے سوا مجموعی طور پر انسانی معاشرے آج بھی ماڈرن ازم کے اصولوں پر ہی کھڑے ہوئے ہیں اور یہ سمجھنا کہ عقلیت، سائنٹفک اندازفکر، آزادی، جمہوریت اور دور جدید کی دیگر اقدار رخصت ہوچکی ہیں، محض ایک غلط فہمی ہے۔ یہ دراصل میں ماڈرن ازم پر ایک تنقید ہے۔

اس بات کو سمجھنا اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ ہمارے بعض فکری حلقوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ پوسٹ ماڈرن ازم میں مغربی افکار پر کی جانے والی تنقید کا مطلب عقلیت ماڈرن ازم کی شکست ہے۔ہم اپنے مضامین، اپنے فکری حلقوں میں ماڈرن ازم کی شکست پر شادیانے بجاتے رہیں گے اور دنیا ماڈرن ازم کی پیدا کردہ خرابیوں سے نجات پالے گی، ایسا سمجھنا سوائے خوش فہمی کے اور کچھ نہیں۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ماڈرن ازم کے افکار انفارمیشن ایج کے آغاز کے ساتھ مغرب سے آگے بڑھ کر مشرقی اقوام کو فتح کررہے ہیں۔ عالمی سیاست کے افق پر نمودار ہونے والے تمام اہم کردار چاہے چین اور ہندوستان کی طرح ان کا تعلق مشرق سے ہو، دراصل ماڈرن ازم کی راہ کے مسافر ہیں۔

ایسے میں کرنے کا اصل فکری کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی اور قرآن مجید کی تعلیم کو بنیاد بنا کر ازسرنو اسلامی تعلیمات کو پیش کرنا ہے۔وحی نے زمانہ قدیم میں بھی انسانیت کو ظلم کی بھٹی سے نجات دلائی تھی اور دور جدید میں بھی وحی کو سمجھنے اور اس پر عمل میں نجات ہے۔آج کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے بہترین دماغوں کو نفرت کی نفسیات سے باہر نکال کر محبت الٰہی سے سرشار کرنا ہے۔وحی اور صاحب وحی کی تعلیمات کو سمجھنے کی طرف لگانا ہے۔آپ کی سیرت کو ان کی زندگی بنانا ہے۔اس کے بغیر ظلم واستبداد نہ پہلے ختم ہوا ہے نہ اب ختم ہوگا۔

سلسلہ روز و شب

ابو یحییٰ

تاریخ اور ختم نبوت

محترم قارئین پچھلے ماہ تاریخ اور ختم نبوت کے حوالے سے ایک مضمون شروع کیا تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نبوت اگر ختم کی گئی ہے تو اس سے قبل کس طرح دین کی حفاظت کا وہ اہتمام کیا گیا ہے جس کی بنا پر ہمارے دین کی تعلیمات اب ایک تاریخی مسلّمے کی حیثیت سے دنیا کے سامنے موجود ہیں۔ اس ماہ اس مضمون کا باقی اور زیادہ اہم حصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

رسول اللہ صلی وعلیہ وسلم کے دور میں بننے والی تاریخ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم 570ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور 632ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ نے 40 برس کی عمر میں اعلان نبوت فرمایا اور صرف 23 برس کی مختصر مدت کے بعد آپ انسانی تاریخ کے سب سے کامیاب انسان کی حیثیت سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ آپ کو اپنی قوم پر جو غلبہ اور اپنے مشن میں جو کامیابی حاصل ہوئی اس کے چند پہلو بہت اہم ہیں۔ یہ پہلو درج ذیل ہیں۔

ا) پوری قوم کا ایمان

آپ نے 40 برس کی عمر میں نبوت کا اعلان کیا تو آپ تنہا مسلمان تھے۔ مگر 23 برس کے بعد جب آپ دنیا سے رخصت ہوئے تو انسانی تاریخ کا یہ عجیب واقعہ رونما ہو چکا تھا کہ آپ کی پوری قوم یعنی بنی اسماعیل، تمام کے تمام، آپ پر ایمان لا کر آپ کے پیروکار بن چکے تھے۔ آپ اور آپ کی قوم کے درمیان جاری کشمکش میں بمشکل ہزار لوگ ہی مارے گئے۔ باقی قوم ایمان

لے آئی اور آپ کا مشن پھیلانے کے لیے آپ کے بعد موجود رہی۔ خیال رہے کہ آپ کی قوم دنیا کے دور دراز خطے میں موجود کوئی چھوٹا قبیلہ یا گروہ نہ تھا بلکہ اُس دور کی متمدن دنیا کے مرکز میں واقع لاکھوں مربع میل پر پھیلے ہوئے جزیرہ نما عرب میں لاکھوں افراد پر مشتمل ایک پوری قوم تھی۔

۲) تربیت کا بھرپور وقت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن 8 ہجری میں فتح مکہ کے ساتھ پورا ہو گیا۔ کفار مکہ کے قبول اسلام کے بعد تمام عرب سے آپ کی مخالفت ختم ہوگئی اور لوگ جوق در جوق ایمان لانے لگے۔ فتح مکہ رمضان 8 ہجری تا وفات ربیع الاول 11 ہجری تک آپ کے پاس ڈھائی برس کا وقت تھا جس میں لوگ آپ کے پاس آتے رہے اور دین سیکھتے رہے۔ آپ کے پاس پرامن حالات میں لوگوں کو دین سکھانے، سمجھانے اور پھیلانے کے لیے 30 مہینے کا طویل وقت تھا۔ پھر آخری حج کے موقع پر تمام عرب سے کم و بیش ایک لاکھ لوگ حج کے لیے آپ کے ساتھ آئے۔ گویا عرب کے ہر گھر، بستی، قریے کا ایک نہ ایک آدمی لازماً اس موقع پر موجود تھا۔ اس حج کا خصوصی مقصد لوگوں کو یہ موقع دینا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست دین سیکھ لیں۔ اس طرح یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ جو دین آپ لائے وہ پوری قوم کو خود اپنی نگرانی میں سکھا کر رخصت ہوئے۔

۳) مکمل سیاسی استحکام اور غلبہ

اس دنیا میں کسی بھی فکر کے لیے یہ بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی اور علمی بنیادوں پر مخالفین پر فتح حاصل کر لے تب بھی مخالفین کی سیاسی طاقت اس کے قدم جمنے نہیں دیتی۔ تاہم نبیکریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی زندگی میں عرب پر مکمل سیاسی غلبہ حاصل ہو چکا تھا۔ آپ پورے عرب کے بلا

شرکت غیر حکمران تھے اور تمام مخالفین اسلام لے آئے، ختم ہو گئے یا پھر ذلت آمیز محتاجی میں سر اطاعت خم کیے ہوئے تھے۔ یہ غلبہ آپ کے خلفائے راشدین کے درمیانی عرصے تک تقریباً اگلے 20 برس میں اتنا بڑھا کہ تمام متمدن دنیا آپ کے ابتدائی پیروکاروں کے سامنے مغلوب ہو چکی تھی۔ تمام دنیا کے خزانے، وسائل اور طاقت اب مسلمانوں کے قبضے میں تھی۔ چنانچہ اس بات کا کوئی امکان ہی نہیں تھا کہ کوئی بیرونی یا اندرونی قوت بانی اسلام کی تعلیمات کے فروغ اور پھیلاؤ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈال سکے۔ کیونکہ ہر طاقت مسلمانوں کے سامنے مغلوب ہو چکی تھی اور دنیا کا ہر خزانہ ان کے لیے کھل چکا تھا۔

۴) تربیت یافتہ ٹیم

آپ کا اگلا امتیاز یہ تھا کہ آپ کی ابتدائی نبوت ہی سے آپ کو انتہائی مخلص، باشعور اور قابل ساتھیوں کی دولت میسر آ گئی تھی۔ مکہ میں آپ پر سیکڑوں لوگ ایمان لا چکے تھے۔ مدینہ میں ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں کو قرآن میں بار بار یہ بتا دیا گیا تھا کہ دنیا تک دین حق کی شہادت دینا ان کی ذمہ داری ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے سیکڑوں اہل ایمان مکہ کے 13 برس اور پھر ہزاروں لوگ مدینہ کے 11 برسوں میں لمحہ لمحہ حضور کے ساتھ رہے۔ آپ کے پیغام کو بھرپور طریقے سے سمجھا۔ آپ کی نگرانی میں دو عشرے تک اس پر عمل کیا۔ اقوام عالم پر شہادت حق کے شعور اور اتنی زیادہ تربیت کے بعد یہ لوگ جب خلافت راشدہ میں دنیا کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کا اصل مقصد ایک ہی تھا۔ وہ یہ کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر شہادت حق دی تھی، ٹھیک اسی طرح انھوں نے اس دور کی متمدن دنیا کے انسانوں کے سامنے شہادت حق دی۔ چنانچہ ایک طرف انھوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا ہونے والے کسی بھی ممکنہ انحراف کو پوری قوت کے ساتھ روکا، بلکہ آگے بڑھ کر ملینز (Millions) کی آبادی پر مشتمل

مڈل ایسٹ میں ہر جگہ اسلام کا پیغام ٹھیک اسی طرح پہنچایا جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں تک پہنچایا تھا۔

۵)عالمی تاریخی تسلسل کا حصہ بن جانا

جیسا کہ پیچھے بیان ہوا کہ جزیرہ نما عرب کوئی دور دراز علاقہ نہ تھا بلکہ چین و ہند سے لے کر مصر و یونان تک پھیلی اس وقت کی متمدن دنیا کے عین وسط میں واقع علاقہ تھا جہاں لاکھوں لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ اس وقت کی دو عظیم ترین سپر پاور یعنی رومی اور ساسانی سلطنت کے پڑوسی تھے اور عرب کی سرحدوں پر ان سپر پاور کے حلیف عرب قبائل کی حکومتیں قائم تھیں۔ تجارت کے لیے سردیوں میں یمن جاتے جہاں مشرق سے چین و ہندوستان کا مال آتا اور گرمیوں میں شام و فلسطین جاتے جہاں مغرب سے مصر وافریقہ کا مال آتا۔

سیاست اور تجارت کے اس پس منظر کی بنا پر عرب میں اس زمانے میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کوئی مقامی واقعہ نہیں تھا بلکہ اُس دور کی پوری دنیا کو معلوم ہو رہا تھا کہ عرب میں کیا انقلاب آچکا ہے۔ پھر خلافت راشدہ میں تو یہ دونوں ریاستیں مسلمانوں سے شکست کھا گئیں اور خود مسلمانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ یوں عرب کا انقلاب کوئی مقامی واقعہ نہ رہا بلکہ اسی زمانے میں بین الاقوامی تاریخ کا ایک مسلمہ حصہ بن گیا۔

۶)مسلمانوں کا مسلسل باقی رہنا

اس سلسلے کی آخری اہم ترین کڑی یہ ہے کہ ابتدائی غلبے کے بعد دنیا کے نقشے سے کبھی بھی مسلمان نہیں مٹائے جا سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کروڑوں بلکہ اربوں مسلمان ہر دور میں دنیا کے ہر خطے میں موجود رہے۔ بیسویں صدی کی ابتداء کے چند عشروں کو چھوڑ کر مسلمان ہمیشہ اقتدار میں رہے۔ وہ پورے تواتر، تسلسل اور اطمینان اور سکون کے ساتھ

اپنے اس دین پر عمل کرتے رہے جو ان کے نبی انھیں دے کر رخصت ہوئے۔

ایک استثنائی واقعہ

مذکورہ بالا تمام چیزیں انسانی تاریخ میں پیش آنے والا ایک استثنائی واقعہ ہے جو کبھی پہلے پیش آیا نہ بعد میں ظہور پذیر ہوسکا۔ اب تمام چیزوں کو جمع کر لیجیے تو جو نتیجہ نکل رہا ہے وہ یہ ہے دنیا میں کسی بھی فکر کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں رہا کہ فکر کا بانی اپنی دعوت پیش کرے اور اس کی زندگی ہی میں لوگ اسے قبول کر لیں۔ پھر اسے اقتدار کا تحفظ اور پرامن حالات بھی میسر آجائیں جس میں اس کی دعوت اور پیغام مکمل طور پر ہر طرح کے بیرونی خطرے سے محفوظ رہ سکے۔ وہ پورے اطمینان سے ان کی تربیت کرے، پھر اس کو ایسی مخلص اور باشعور ٹیم بھی میسر ہو جو اس کی تعلیم اور مشن کو بغیر کسی انحراف اور کمی بیشی کے دوسروں تک پہنچائے۔ عین اس کی حین حیات اور اس کے فوراً بعد یہ انقلاب عالمی تاریخی تسلسل کا غالب حصہ بن جائے اور پھر تواتر اور تسلسل کے ساتھ اُس وقت سے آج تک اس کے پیروکار اس دین پر عمل بھی کرتے رہیں۔ یہ واقعہ انسانی تاریخ میں نہ پہلے کبھی ہوا نہ بعد میں کبھی ہوسکا۔

اس بات کو دور جدید اور دور قدیم کی ایک مثال سے سمجھیں۔ حضرت موسیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تاریخ کے دوسرے کامیاب پیغمبر ہیں۔ قوم کا ایمان، مخالفین پر غلبہ، سیاسی اقتدار اور نام لیواؤں کا باقی رہنا آپ کو سب ملا۔ مگر آپ کی زندگی ہی میں آپ کی ٹیم نے بار بار آپ سے بے وفائی کی اور آپ کے بعد تاریخ میں بار بار آپ کی قوم کی جڑ کاٹی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آپ کی لائی ہوئی کتاب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہ رہی اور آپ کی تعلیمات کی بنیادی چیز یعنی نماز جیسی بنیادی عبادت سے آج کے یہود خود پوری طرح واقف نہیں۔ جبکہ مصر کی اپنی تاریخ میں اِس پورے واقعے کا کوئی ریکارڈ سرے سے موجود ہی نہیں۔ جب حضرت موسیٰ جیسے کامیاب

پیغمبر کا یہ حال ہے تو باقی پیغمبروں کو تو جانے دیجیے۔

جدید اور سیکولر مثال کمیونزم کی ہے۔ اس کے بانی کو اس کا غلبہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا اور پھر اس کے پیروکاروں نے اس کے افکار کی عملی شکل کو وجود لانے میں جو کچھ کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے بلکہ سوویت یونین کی شکست کے بعد خود کمیونزم تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے برعکس نبی آخرالزماں کی دعوت مذکورہ بالا تاریخی حقائق کی بنا پر جیسے نازل ہوئی ویسے ہی آج کے دن تک موجود ہے۔

ایک نئی تاریخی حقیقت کا ظہور

مذکورہ بالا چھ عوامل کی بنا پر آج یہ ایک مسلمہ اور ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیشخصیت اور عرب کا انقلاب جس طرح تاریخ کا ایک مسلمہ ہے، ٹھیک اسی طرح آپ کی تعلیمات جو خود ہمیشہ جزئی چیزوں اور تفصیلات پر مشتمل ہوتی ہے بالکل ایسے ہی موجود ہے جیسے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تھیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک طرف وہ سارے مذکورہ بالا تاریخ عوامل موجود تھے جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا محفوظ رہنا تاریخی طور پر ممکن ہوا بلکہ آپ نے اس کے ابلاغ کے لیے جو اہتمام کیا اس کی بنا پر آپ کی تعلیمات کچھ افراد تک نہیں رہیں بلکہ پوری قوم کی قولی اور عملی روایت کا حصہ بن گئیں۔ یعنی آپ کی تعلیمات کے جزئی عناصر بھی لاکھوں اور پھر کروڑوں افراد کے قول و فعل کا اس طرح حصہ بن گئے کہ تاریخ میں پہلی دفعہ جزئیات بھی مسلّمات بن گئیں۔

اس تعلیم کا پہلا جز قران مجید ہے۔ الحمد سے والناس یہ کتاب جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ نے کیا تھا خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مرتب ہوگئی تھی۔ آپ خود حافظ قران تھے اور آپ کے زمانے ہی میں ہزاروں حفاظ موجود تھے۔ قرآن کے حفظ کی وجوہات بالکل واضح

ہیں۔ اول یہ کہ اس دور میں علم کا معیار چیزوں کو زبانی یاد کرنا تھا۔اس سے کہیں زیادہ اہم یہ حقیقت تھی کہ پنج وقتہ نماز جو اسلام کی بنیادی شرط تھی اور اس زمانے میں منافقین تک کو بھی ادا کرنی پڑتی تھی،قران کی قرات اس کا لازمی حصہ تھی۔ چنانچہ لاکھوں لوگوں کے لیے لازمی تھا کہ نماز پڑھنی ہے تو قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ یاد کرنا ہوگا۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ عرب ہماری طرح تمام نمازیں’’قل ھو اللہ احد ‘‘ کے سہارے ادا کر لیتے ہوں گے۔انھیں قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ یاد ہوگا۔مزید یہ کہ تہجد کی نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ صحابہ کی ایک بڑی تعداد کا معمول تھا۔ اس میں طویل قرات کی وجہ سے لوگ پورا قرآن یاد کر لیتے تھے۔ چنانچہ ہزاروں حفاظ حضور کے زمانے ہی میں موجود تھے۔ پھر حضرت عمر کے دور میں تراویح کا وہ اہتمام شروع ہوا جس کی بنا پر عالم اسلام کے ہر قریے اور ہر مسجد اور ہر بستی میں کسی نہ کسی حافظ کا ہونا لازمی ہوگیا۔تب سے آج تک یہ رسم ایسے ہی جاری ہے۔ان لاکھوں حفاظ کی وجہ سے قرآن مجید جیسا کہ وہ نازل ہوا ویسا ہی آج کے دن تک موجود ہے۔

ایک اشکال کا جواب

بعض قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ اس موقع پر میں نے کتابت قران کا ذکر نہیں کیا۔ بلاشبہ حفاظت قران مجید کے لیے یہ اہتمام بھی کیا گیا کہ نازل ہونے والی وحی کو اسی وقت لکھوا لیا جاتا تھا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حفاظت قرآن کا اصل نہیں بلکہ ثانوی اہتمام تھا۔اللہ تعالیٰ نے تورات تختیوں پر اتاری مگر قرآن قول کی شکل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر محفوظ کیا گیا۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ منشائے الٰہی یہ تھا کہ قرآن کی اصل حفاظت قول اور سماعی طریقے پر کی جائے۔ یہ بڑی حکیمانہ بات تھی۔ کیونکہ اُس وقت عرب میں نہ کاغذ تھا، نہ پرنٹنگ پریس ایجاد ہوا تھا اور نہ عام عربوں میں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ بلکہ اصل اہتمام چیزیں

یاد کرنے کا ہی تھا۔نماز میں قرآن پڑھنے کی شرط نے اس ذوق کو مذہبی ضرورت بنا دیا اور یوں بہت سا قرآن ہر شخص کو اور پورا قرآن بہت سے لوگوں کو یاد ہو گیا۔ یوں قرآن کی اصل حفاظت حفظ و سماعت کے طریقے پر ہوئی ہے۔ کتابت ایک ثانوی اور اضافی اہتمام تھا۔ یہ بات سیدنا عمر کی اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے جب جنگ یمامہ میں 400 یا بعض روایات کے مطابق 700 سے زائد صحابہ کی شہادت ہوئی تو آپ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اسی طرح جنگوں میں صحابہ کرام شہید ہوتے رہے تو قرآن ضائع نہ ہو جائے۔صاف ظاہر ہے کہ اصل حفاظت حفظ سے ہو رہی تھی کتابت وہ اضافی اہتمام تھا جو صرف اس خطرے کے پیش نظر اختیار کیا گیا کہ حفاظ کی اکثریت شہید ہوگئی تو قرآن متاثر نہ ہو۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ حضرت عمر کے دور میں تراویح کا اہتمام ہوتے ہی یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

ایک مناظرے کی روداد

قرآن کی اصل حفاظت کتابت کے بجائے حفظ و سماعت کو نمایاں کرنے کی ایک اور وجہ ہے۔ وہ یہ کہ آج کل کے مسلمانوں میں یہ بات بہت پھیل گئی ہے کہ قرآن کی حفاظت کا اصل ثبوت یہ ہے کہ حضرت عثمان کا مرتب کیا ہوا قرآن کا نسخہ استنبول کے توپ کاپی میوزیم اور تاشقند میں محفوظ ہے۔ ہم بھی عرصے تک یہی سمجھتے تھے۔مگر بارہ تیرہ برس پہلے میں نے ایک مناظرے میں یہ تماشہ دیکھا کہ ایک مسلمان مناظر نے مسیحیت پر اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لیے جیسے ہی یہ بات کہی، جواب میں مسیحی پادری کھڑا ہوا اور اس نے بتایا کہ میں نے خود ان نسخوں کو دیکھا ہے اور ان کی کاربن ڈیٹنگ کی ہے۔اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسخے اول تو حضرت عثمان کے زمانے کے بہت بعد کے ہیں۔ یعنی دوسری صدی ہجری کے اور دوسرے ان میں موجود قرآن پورا ہے بھی نہیں۔اس کے بعد سارے مسلمان حاضرین اور ناظرین کے پاؤں تلے سے

زمین نکل گئی۔ اوراب یہ بات کم وبیش سارے علمی حلقوں میں تسلیم کرلی گئی ہے کہ عہد خلافت راشدہ کا کوئی قرآن اس وقت دنیا میں موجود نہیں ہے۔ اس لیے اسلام مخالف مستشرقین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی نسبت یہ کہنا کہ یہ بعینیہ وہی کتاب ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی درست نہیں۔

تاہم جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ ایک غلط فہمی ہے۔قرآن اصل میں حفظ کے ذریعے محفوظ ہوا ہے۔ اور مذکورہ بالا ان چھ عوامل کی بنا پر جو ہم نے شروع میں گنوائے ہیں۔ یہ بات یقینی ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ اگر کوئی اس کا انکار کرتا ہے تو پھر وہ اس کا بھی انکار کرتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نام کی کوئی ہستی عرب میں مبعوث ہوئی۔ انھیں اپنی قوم پر پورا غلبہ حاصل ہوا۔ ان کے ساتھ 20 برس تک ہزاروں افراد دن رات رہ کر دین سیکھتے رہے۔ ان لوگوں کو دنیا پر اقتدار حاصل ہوا اور آج کے دن تک ان کے ماننے والے دنیا میں موجود رہے۔ اگر ان تمام مسلّمات کا انکار نہیں ہوسکتا تو پھر اس حقیقت کا انکار بھی نہیں ہوسکتا کہ جو قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا وہ آپ کی زندگی میں محفوظ کرلیا گیا اور آپ کے ساتھیوں نے وہ پورے اہتمام سے باقی دنیا تک اور پھر ہر دور میں آپ کے پیروکاروں نے اسے پورے اہتمام سے محفوظ کیا ہے اور آج کے دن تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔

جو شخص اس حقیقت کا منکر ہو اسے یہ سوچنا چاہیے کہ آج کے گئے گزرے دور میں جب پرنٹنگ پریس کی ایجاد کے بعد حفظ قرآن ثانوی حیثیت اختیار کرگیا ہے، لاکھوں مسلمان پورا قرآن حفظ کرتے ہیں تو زمانہ نبوت اور خلافت راشدہ کے دور میں یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ صحابہ کرام نے اس فریضے میں کوئی کوتاہی برتی ہوگی۔ اس لیے یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہزاروں اور آپ کے

بعد لاکھوں لوگ قرآن کو پورا یاد کرتے رہے اور یہی قرآن آج ہمارے پاس موجود ہے۔

اسلاف کی رائے

قرآن کی طرح ٹھیک یہی معاملہ دین کے عملی ڈھانچے کا ہے جو عبادت، معاشرت اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے اگر لاکھوں لوگ قرآن کو نمازوں میں پڑھ رہے تھے تو اس کے ساتھ وہ نماز بھی پڑھ رہے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے، حج بھی کرتے تھے، زکوۃ بھی دیتے تھے، نکاح وطلاق، معیشت و معاشرت، رسوم و آداب میں ہر جگہ لوگ اسلام کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ ایک پوری قوم کے ایمان لانے، تربیت یافتہ ہونے، مسلسل موجود ہونے کا کوئی دوسرا نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کا انکار تاریخی مسلمے کا انکار ہے۔ جس طرح قرآن مجید پر خلافت راشدہ کے لکھے ہوئے قرآن کی گواہی طلب کرنا ایک غیر علمی بات ہے، اسی طرح اس عملی ڈھانچے کو کسی روایت پر موقوف سمجھنا ہر اعتبار سے ایک غیر علمی رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کام لاکھوں لوگ کر رہے ہوں اور علما کی پوری روایت اس کی نگرانی کر رہی ہو وہ اپنی ذات میں خود ایک مسلمہ بن جاتی ہے۔ اس پر خارج سے کوئی ثبوت طلب نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وہ طریقہ ہے جس پر ہمارے اسلاف اور متقدمین دین کی حجیت ثابت کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے عظیم امام شافی اپنی کتاب الرسالہ میں اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔

هذا مما كلف العباد أن يعقلوه ويعملوه ويعطوه من أنفسهم وأموالهم وأن يكفوا عنه ما حرم عليه منه وهذا الصنف كله من العلم موجودا نصا في كتاب الله وموجودا عاما عند أهل الاسلام ينقله عوامهم عن من مضى من عوامهم يحكونه عن رسول الله ولا يتنازعون في حكايته ولا وجود به عليهم وهذا العلم العام الذي لا يمكن فيه الغلط من الخبر ولا التأويل ولا يجوز فيه التنازع (1/358)

اس کا مفہوم درج ذیل ہے:

یہ وہ احکام ہیں جنہیں سمجھنا، ان پر عمل کرنا، اپنے جان و مال کے ذریعے اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا اور حرام کئے گئے کاموں سے بچنا ہر شخص پر لازم ہے۔ یہ تمام احکام اللہ کی کتاب، واضح نص میں بیان کئے گئے ہیں اور مسلمانوں میں ان پر عام طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ لوگ انہیں نسل در نسل منتقل کرتے ہیں اور یہ سلسلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم سے چلا آ رہا ہے۔ ان احکام کے منتقل کرنے یا ان کی فرضیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ وہ علم ہے جس سے متعلق معلومات اور اس کی تشریح ہر طرح کی غلطیوں سے پاک ہے۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کا آخری جملہ پھر پڑھیے کہ کس طرح یہ علم ہر غلطی اور اختلاف سے پاک ہے۔ پھر یہی بات ایک علم حدیث کے ایک اور بہت بڑے امام حافظ ابن عبد البر (463ھ) اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں اس طرح لکھتے ہیں:

علم کی دو بنیادیں ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ سنت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جسے تمام لوگ تمام لوگوں تک (نقل کافہ عن کافہ) منتقل کرتے ہیں۔ یہ وہ حجت قاطع ہے جس میں کسی قسم کا اختلاف ثابت نہیں اور اس کا انکار نصوص الٰہی کے انکار کے مترادف ہے۔''، (ص625)

دین کی تاریخی حجیت ثابت کرنے کا یہ وہ طریقہ تھا جو ہمارے متقدمین نے اختیار کیا تھا۔ اس طریقے میں دینی تعلیمات وہ مسلمہ بن جاتی ہیں، جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت ایک ناقابل انکار حقیقت بن جاتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دنیا کے کسی دوسرے دین کو حاصل نہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ مسلمانوں نے اس کے علاوہ اپنے نبی کے قول، علم اور تقریر کی حفاظت کا بھی حتی الوسع بہت اہتمام کیا ہے۔ یہ بڑا قیمتی اور اہم ذخیرہ ہے جس کے ذریعے سے دین کو سمجھنے، عمل

کرنے اور نئے پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔لیکن ہم اسے یہاں اس لیے زیر بحث نہیں لائے کہ یہ ذخیرہ ہم مسلمانوں کے نزدیک تو حجت بن سکتا ہے، غیر مسلموں کے لیے تاریخی حجت اگر کوئی چیز بن سکتی ہے تو وہی تواتر کے ساتھ ملا ہوا دین ہے اور جس کا انکار کرنا علم تاریخ کی بنیاد پر ناممکن ہے۔

خلاصہ بحث

یہ بحث ذرا طویل ہوگئی، مگر یہ اتنی غیر معمولی اہمیت کی بات ہے کہ اسے پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔ ایک ایسے دور میں جب انٹرنیٹ کی وجہ سے جب غیر مسلموں کے تمام اعتراضات ہمارے گھر گھر میں پہنچ رہے ہیں، ہم پر لازم ہے کہ اپنے دین کی حقانیت کے دلائل علم کے ان مسلمات کی بنیاد پر لوگوں کے سامنے پیش کریں جن کا انکار کرنا ممکن نہیں۔شترمرغ کی طرح ریت میں سر چھپا لینا یا پھر کمزور جگہ سے اسلام کا دفاع کرنا ایک خطرناک رجحان ہے۔ اس طرح ہم اپنے دین کا مقدمہ خود کمزور کردیں گے۔

اگر آپ حق پر کھڑے ہیں تو آپ کو چلا کر بات کرنے کی ضرورت نہیں
اور اگر آپ حق پر نہیں ہیں تو چلا کر بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں (ابو یحییٰ)

سوال و جواب

ابو یحییٰ

درود شریف اور ذکر الٰہی

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے آپ اللہ کی رحمت سے خیر و عافیت سے ہو نگے۔سر مجھے آپ سے کچھ رہنمائی چاہیے تھی۔سر میں اپنے علم کی کمی اور عمل کے ناقص ہونے کی وجہ سے آپ سے یہ پوچھ رہی ہوں۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں پورے شعور سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھوں۔ویسے بھی ایک مسئلے کی وجہ سے کسی نے وظیفہ بتایا ہے درود ابراہیمی پڑھنے کا،مسئلہ یہ ہے کہ مجھے شیطان کی طرف سے وسوسہ آتا ہے کہ درود پڑھنے سے اللہ کی تعریف تو نہیں ہوتی تو کثرت سے درود پڑھنا کے بجائے اللہ کی حمد و ثنا کے کلمات پڑھوں۔یعنی پورے یقین اور دل کے اطمینان کے ساتھ نہیں پڑھ پاتی، میں اس کیفیت سے نکلنے کے لئے کیا کروں؟ اگر صرف درود ہی کثرت سے پڑھا جائے تو اللہ کے ذکر میں کمی والی بات تو نہیں ہے نا؟ میرا دل چاہتا ہے میں پوری محبت اور دل کی حاضری کے ساتھ پڑھوں لیکن کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ مجھے درود ابراہیمی کی فضیلت والی احادیث کا بھی علم ہے ۔اہمیت کا بھی علم ہے لیکن دل کی کیفیت سے عاجز ہوں۔رہنمائی فرمایئے۔ فائزہ خان

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

درود بھی ذکر ہی کی ایک شکل ہے کیونکہ اصل میں یہ اللہ سے مانگی جانے والی ایک دعا ہے۔ یہ اللہ کی اس نعمت کا اعتراف ہے کہ اس نے ہم پر کرم کر کے اپنے محبوب کو ہمارے درمیان بھیجا

اوران کے ذریعے سے ہم نے ہدایت پائی۔ اب ہم ایک دعا کے ذریعے سے اللہ کی اس عظیم نعمت پر اس ہستی کے لیے دعا کی درخواست ور اللہ کا شکر ادا کر رہے ہیں۔ اس لیے درود پڑھتے ہوئے کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں۔ البتہ اللہ کی حمد، تسبیح و تکبیر خود نبی کریم کا سکھایا ہوا طریقہ اور قرآن کا حکم ہے۔ اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لیے دردو بھی پڑھیں اور ذکر الٰہی بھی کرلیں۔

والسلام

ابو یحییٰ

عمرہ و حج میں دل کی کیفیت

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

الحمد للہ، اللہ نے دو ہفتے پہلے عمرے کی سعادت نصیب کی۔ لیکن سر میں آپ سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتی ہوں۔ ہوا یوں کہ میں جن کیفیات اور محسوسات کا اندازہ کر کے وہاں گئی تھی وہاں جا کے میری کیفیت وہ نہ ہوئی۔ میں جب تک گئی نہ تھی تو بیت اللہ کا تصور کر کے اور اس کے بارے میں سن کر مجھے بہت رونا آتا تھا اور میں اللہ کے احساس اور اس جگہ کا تصور کر کے روتی تھی محبت میں سوچتی تھی جب آنکھوں سے دیکھوں گی تو کیا حالت ہوگی۔ لیکن جب میں وہاں گئی اور بیت اللہ کو دیکھا تو کوئی خاص احساس نہ جاگا۔ نہ بہت دل دھڑ کا نہ بہت رونا آیا۔ اور میں بہت ڈر گئی کہ ایسا کیوں ہوا۔ شدت سے گناہوں کا احساس ہوا۔ پہلے دن کے بعد پھر فرق آ گیا، مطلوبہ کیفیت نصیب ہو گئی، لیکن کیفیت بدلتی بھی رہی کبھی مایوسی اور بیزاری کبھی اللہ کا قرب

دعاؤں کی قبولیت کا احساس۔لیکن میں یہ سوچ کے گئی تھی کہ وہاں تو اللہ کی خاص رحمت کے سایہ میں خود کو محسوس کروں گی۔دل ہر وقت اللہ کے قرب کو محسوس کرے گا۔ جو دعا مانگوں گی قبول ہوگی لیکن وہاں پر بھی میں بے چین ہوئی وسوسے آتے کے اللہ قبول نہیں کرے گا کچھ بھی۔اور کبھی بہت سکون ہوتا، اللہ کی رحمت محسوس ہوتی تو مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ دل بدل کیوں جاتا ہے، اللہ کا گھر، اسکا قرب اور میرا دل اتنا بند، الجھا ہوا۔اور ایک خاص دعا جس کے لئے میں گئی تھی وہ مانگتے ہوئے بھی دل الٹا پلٹتا رہتا،کبھی دل کو یقین آجاتا ہوگئی قبول،کبھی بے یقینیکہ نہیں ہو گی۔میں بہت خوفزدہ رہی وہاں۔اور یہ بھی کہ لوگ کہتے ہیں وہاں اللہ کی رحمت ہوتی ہے مجھے تو وہاں اللہ سے ڈر زیادہ محسوس ہوا، مجھے اللہ کی بے نیازی محسوس ہوئی کے اللہ کو میری ضرورت نہیں ہے وہ مجھ سے بہت بے نیاز ہے، ہاں یہ ضرور سمجھ آگئی کہ میرا اس کے سوا کوئی نہیں۔میں نے بہت توبہ بھی کی ہے اللہ سے معافی مانگی ہے۔واپس آتے ہوئے پھر دل بند محسوس ہوا۔میں نے اللہ سے بہت دعا کی کے مجھے تھوڑا سا احساس دے دیں کے میری دعائیں قبول ہو جائیں گی،لیکن دل کے اندر کوئی احساس نہیں جاگ رہا تھا، مجھے لگا میں مجرموں کی طرح واپس آرہی ہوں۔خوفزدہ اور بے چین۔

واپس آکر الحمد للہ کچھ افاقہ ہے۔نمازیں بھی کچھ اچھی ہوئی ہیں، دعاؤں میں بھی دل لگا ہے، اللہ سے تعلق بھی محسوس ہورہا ہے۔پھر جانے کو بھی دل مچل رہا ہے، مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ وہاں جو میری کیفیت تھی وہ میرے گناہوں کا وبال تھا یا وہاں ایسی کیفیت باقی لوگ بھی محسوس کرتے ہیں۔مجھے وہاں اللہ کا نیا انداز پتہ چلا، بے نیازی کا اور میں چاہتی ہوں اللہ مجھ سے بے نیاز نہ ہو مجھ پر رحمت کرے۔میں اب اللہ کو راضی کرنے کی کوششوں میں ہوں میرے لیے دعا کریں۔

فائزہ خان

جواب: وعلیکم السلام

بیت اللہ کی حاضری کو قران مجید میں اللہ تعالیٰ نے خود موضوع بنالیا ہے۔اس ضمن میں ہمارے اپنے احساسات و کیفیات اصل معیار نہیں بلکہ قران مجید کے الفاظ معیار ہیں۔قران کریم میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر بیان فرماتے ہیں کہ اس موقع پر جو نیکی کے کام تم کرو گے اللہ ان سے واقف ہے،(البقرہ 197:2)۔آیت 158 میں واضح ہے کہ اس موقع پر فرائض کے علاوہ جو نیکی کا کام انسان اضافی طور پر خوش دلی سے کرے تو جان لے کہ اللہ تعالیٰ بہت قدردان اور علم والے ہیں۔سورہ حج آیت 36 میں اسی پس منظر میں واضح طور پر ایسے نیکوکاروں کو خوش خبری سنائی گئی ہے۔

آپ اور ہر زائر کو چاہیے کہ حج وعمرہ کے موقع پر اپنے دل کو معیار بنانے کے بجائے قرآن کریم کے ان بیانات کو معیار بنائے۔اسے سمجھ لینا چاہیے کہ جس ہستی کے لیے وہ بیت اللہ گیا ہے وہ اس کے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔نہ صرف واقف ہے بلکہ بڑا قدردان بھی ہے۔ اور اسی لیے خوشخبری دے رہا ہے کہ ایسے نیکوکاروں کا اجر کسی صورت ضائع نہیں جائے گا بلکہ جنت کا بدلہ ان کا منتظر ہے۔

باقی رہی کیفیات تو وہ آنی جانی چیز ہے۔کیفیات کی حکمت و مصلحت پر میں نے اس مہینے (فروری 2014) کے ماہنامہ انذار میں ''تیرا ملنا ترا نہیں ملنا'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ یہ جلد ہی سائٹ پر اپ لوڈ ہو جائے گا۔اسے پڑھ کر اس حوالے سے آپ کے ذہن میں پیدا ہونے والے تمام اشکالات انشاءاللہ رفع ہو جائیں گے۔

بیت اللہ کے متعلق یہ بات سمجھ لیجیے کہ اس کا ایک خاص ماحول ہے۔ یہ ماحول بادشاہ کے دربار کا ماحول ہوتا ہے۔اس میں شاہانہ عظمت وجلال ہی کا غلبہ ہوتا ہے۔اس میں بے نیازی ہی

ہوتی ہے۔مگر وہاں جا کر اصل اسی چیز کو دریافت کرنا ہوتا ہے کہ جو ہستی اتنی بے نیاز ہے وہ مجھ پر کس طرح مہربان ہو چکی ہے کہ مجھے یہاں بلالیا۔حرم میں موجودگی کا مطلب ہی یہی ہے کہ مالی، جسمانی اور دیگر اعتبارات سے آپ ٹھیک ہیں۔ یہ کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ان کا احسان مان کر شکر گزاری کا جذبہ محسوس کرنا چاہیے۔ یہ جذبہ لازماً اللہ کی نظر عنایت کو متوجہ کرے گا۔ چاہے ہم پر کوئی کیفیت طاری ہو یا نہیں۔

والسلام

ابو یحییٰ

عورتوں کی ذمہ داریاں

سوال: السلام علیکم

سر میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں کہ ایک مسلمان عورت کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟ خصوصاً آج کل کے دور میں ایک مسلمان عورت کیسی ہونی چاہیے؟ کیا عورت کی ذمہ داری صرف کچن سنبھالنا ہوتا ہے؟ گھر کے کام کاج اور گھر والوں کی ذمہ داریاں اس کی زندگی کا مقصد ہوتی ہیں؟ اگر وہ گھریلو ذمہ داریاں اٹھانے سے انکار کر دے تو کیا اس کے لیے گناہ ہے؟ اسلام نے عورت کو کن چیزوں کی اجازت دی ہے۔ برائے کرم اس کی وضاحت فرما دیجیے۔

سائرہ محمد

جواب: السلام وعلیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

محترمہ سائرہ محمد صاحبہ

نجات کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو بنیادی مطالبات رکھے ہیں ان میں مرد اور عورت کے لحاظ سے کوئی تفریق نہیں ہے۔قرآن مجید کی ایک مختصر سورہ یعنی سورۃ العصر میں اللہ تعالیٰ وہ بنیادی مطالبات ہمارے سامنے رکھتے ہیں جن کو پورا کر کے انسان آخرت کے خسارے سے بچ کر جنت کی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔وہ تین ہیں۔

۱)ایمان

۲)عمل صالح

۳)حق کی تلقین اوراس پر صبر کی تاکید

ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جس میں کسی پہلو سے مرد اور عورت میں کمی بیشی کی گئی ہو۔البتہ چند عورتوں کی فطرت ساخت اور مردوں پر عائد کی گئی بعض اضافی ذمہ داریوں کی بنا پر خواتین کو دیے گئے بعض احکام میں بعض بہت معمولی سے فرق ہیں۔مثلاً عبادات میں طہارت کے مسائل کی بنا پر خواتین کے لیے نماز، روزہ اور حج وغیرہ کے احکام میں تھوڑا سا فرق ہے۔ معاشرت میں مرد و زن کے اختلاف کے موقع پر ان پر زیب و زینت کی نمائش پر پابندی ہے۔میاں بیوی کے رشتے میں ان پر کوئی معاشی ذمہ داری نہیں اوراس وجہ سے ان کے بجائے شوہر کو گھر کا سربراہ بنایا گیا ہے۔معیشت میں وراثت میں بیٹیوں کا حصہ بیٹوں کی بنسبت اس لیے آدھا ہے کہ بیٹیوں پر والدین کی معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی گئی۔اسی طرح بعض ذمہ داریوں جیسے جہاد وغیرہ کا بار خواتین پر نہیں ڈالا گیا ہے۔گرچہ چاہیں تو وہ اپنی مرضی سے اس میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔

اسی طرح اسلام میں خواتین پر عملی زندگی کے کسی معاملے میں حصہ لینے پر کوئی پابندی نہیں۔ تعلیم، کاروبار، ملازمت، کھیل کود میں حصہ لینے پر کوئی روک نہیں لگائی ہے۔اسی طرح گھر کے کام کاج بھی اصلاً ان کی ذمہ داری نہیں۔اس طرح کی اکثر چیزیں ثقافتی ہوتی ہیں۔ ہمارے

ہاں ان چیزوں کو خواتین کی ذمہ داری اگر سمجھا جاتا ہے تو یہ مذہبی نہیں بلکہ سماجی مسئلہ ہے۔ مگر اب صورتحال بدل رہی ہے۔ گھر کے کاموں میں بھی اب خواتین صرف کھانا پکانے تک محدود ہو چکی ہیں۔ بیشتر مڈل کلاس گھرانوں میں عام گھریلو کام کاج ماسیاں کرنے لگی ہیں۔ پچھلی نسل تک یہ سارے کام غیر شادی شدہ لڑکیاں کرتی تھیں، مگر چونکہ اب وہ تعلیم میں مصروف ہوتی ہیں اس لیے والدین ان کے بجائے ماسیوں سے یہ کام کراتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ جو مسئلہ آپ بیان کر رہی ہیں وہ ایک سماجی مسئلہ ہے اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ خواتین اگر گھر کے کام نہیں کرنا چاہتی تو انہیں اپنے گھر والوں سے بات کرنا چاہیے۔ اس کا نیکی گناہ سے کوئی تعلق نہیں۔

البتہ کوئی خاتون اگر گھر کا کام کرتے ہوئے اللہ کی رضا اور خدمت کی نیت رکھے تو یقیناً یہ اس کے لیے بہت باعث اجر ہوگا، بلکہ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ ان کاموں کے برابر باعث اجر ہوگا جو مردوں کو ہی تفویض کیے گئے ہیں یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔

قانون بگڑے ہوئے افراد کے لیے ہوتا ہے
بگڑی ہوئی قوم کے لیے نہیں
بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح
صرف دعوت و تربیت سے ہوتی ہے
(ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

مضامین قران(5)

سابقہ دلیل کا خلاصہ

ہم قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے حوالے سے بیان ہونے والے دلائل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ پہلی دلیل جسے ہم نے تفصیل سے دیکھا تھا ہم نے اسے **انسان کا روحانی پہلو** اور **تاریخی تسلسل** کا عنوان دیا تھا۔ س کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود گرچہ مادی حواس کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ مگر ایسا نہیں کہ خدا کا تصور انسان کے لیے ایک اجنبی اور نامانوس تصور ہے جسے زبردستی اس پر ٹھونسے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انسان اپنی اندرونی ساخت میں چار ایسی چیزیں پاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک عام انسان باآسانی خدا کی ہستی کا ادراک کر لیتا ہے۔

۱) انسان اپنی ہستی کا ایک بھرپور شعور رکھتا ہے۔ وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک ایسی ہی برتر ہستی کا کائنات کا خالق ہونا ممکن ہی نہیں عین فطری ہے۔

۲) انسان عقل و شعور رکھتا ہے۔ یہ عقل و شعور اسے یہ استعداد دیتی ہے کہ وہ انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیوں پر غور کر کے یہ سمجھ لے یہ کارخانہ عالم بخت و اتفاق کی کارستانی نہیں بلکہ ایک خالق کی تخلیق ہے۔

۳) انسان خیر و شر کا اخلاقی شعور رکھتا ہے۔ یہ شعور اسے بتاتا ہے کہ فزیکل لاز پر مبنی کائنات میں انسان کی شکل میں اخلاقی شعور کی موجودگی کسی ایسی ہستی کی طرف ہی سے ممکن ہے جو خود اخلاقی شعور رکھتا ہو۔ دوسری صورت میں یہ اخلاقی شعور ایک مادی کائنات میں اپنے وجود کی کوئی اساس نہیں رکھتا۔

۴) انسان اپنے اندر ایک روحانی پیاس محسوس کرتا ہے۔ جس طرح پانی ایک خارجی حقیقت کے طور پر مادی پیاس کا جواب ہے اسی طرح روحانی پیاس کا جواب خدا کا تصور ہے اور یہ تصور جب انسان کو مل جاتا ہے تو انسان وہی طمانیت محسوس کرتا ہے جو پیاسے کو پانی پی کر ملتی ہے۔

انسان میں یہ سارے پہلو چونکہ قران کے مطابق ''نفخ روح'' کے عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے ہم نے اسے **انسان کا روحانی پہلو** کا نام دیا تھا۔ اس اندرونی تائید کے ساتھ خارج میں خدا کا وجود ابتداء ہی سے انسانی تاریخ کا حصہ رہا ہے۔ اس دنیا میں آنے سے قبل براہ راست اور اس دنیا میں آنے کے بعد مسلسل انبیا اور ان کے معجزات کے ذریعے سے انسان عالم کے پروردگار کی ہستی سے واقف رہے ہیں۔ یہ سب چیزیں مل کر خدا کے وجود کو انسانوں کے لیے ایک معقول اور مانوس وجود بناتی ہیں چاہے اس دنیا میں کسی انسان نے اسے دیکھا ہو نہ چھوا ہے۔ اسی کو ہم نے **انسان کا روحانی پہلو** اور تاریخی **تسلسل** کا نام دیا تھا۔

۲) توجیہ کی دلیل

اللہ تعالیٰ کے وجود کی دوسری دلیل توجیہ کی دلیل ہے۔ یہ دلیل دراصل پہلی دلیل پر کھڑی ہے جسے پیچھے ہم نے **انسان کا روحانی پہلو** اور تاریخی **تسلسل** کا نام دیا تھا۔ اس دلیل کی روشنی میں ہم نے ثابت کیا تھا کہ انسان ایک روحانی، اخلاقی اور عقلی وجود ہے۔ توجیہ کی دلیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ یہ انسان کسی خلا میں نہیں جی رہا بلکہ ایک جیتی جاگتی، زندہ، فعال، متحرک، منظّم، مرتب اور بامقصد دنیا میں کھڑا ہے۔ یہاں بھوک اور پیاس جیسی ضروریات ہیں تو پانی اور خوراک کی شکل میں اس کا مکمل جواب ہے۔ جنسی خواہش ہے تو اس کا جواب موجود ہے۔ ذوق جمال کی طلب ہے تو حسن و کمال کی بہاریں بھی جلوہ فرما ہیں۔ جذبات محبت کا تلاطم ہے تو رشتے ناطے کی وہ ناؤ بھی ہے جو زندگی کا سفر ممکن بناتی ہے۔ غرض یہ دنیا ایک

زندگی، فعال، متحرک اور ممتا بھری ماں کی طرح انسان کی خدمت پر مامور ہے۔

انسان کے اندر جو کچھ طلب ہے یہ کائنات نہ صرف اس کا بھرپور اور مکمل جواب دے رہی ہے بلکہ انتہائی بامقصد طور پر جواب دے رہی ہے۔ مثلاً جنسی جذبہ ایک شدید ترین خواہش ہے۔ مگر اس کے ساتھ زندگی کے تسلسل کا وہ بوجھ بھی لاد دیا گیا ہے جسے اٹھانا بہت مشکل ہے، مگر جنسی خواہش ہر شخص کو یہ بوجھ اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسانی خوراک لذتِ کام و دہن کا سامان ہی نہیں جسم و جان کو طاقت و توانائی کا وہ خزانہ بھی عطا کرتی ہے جس کے بغیر زندگی ایک دن بھی اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے۔

زندگی کی فعالیت اور مقصدیت سے بھرپور جس کائنات کا انسان حصہ ہے وہ الل ٹپ اصولوں پر نہیں کھڑی بلکہ ہر جگہ ایک انتہائی منظّم اور مرتب مشین کی طرح لگاتار کام کیے جا رہی ہے۔ یہ نظم اور یہ ترتیب اتنا حیرت انگیز ہے کہ انسانی عقل اس کو کسی اتفاق کی کارفرمائی ماننے کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی تیار نہیں ہو سکتی۔ عقل اور شعور دونوں کا تقاضہ ہے کہ انھیں یہ بتایا جائے کہ یہ انتہائی حیرت کدہ کس نے تخلیق کیا ہے اور کون اسے چلا رہا ہے۔ پہلی دلیل ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بنیادی سوال کا جواب دے کر انسان کو اس دنیا میں بھیجا تھا، مگر وقت کے ساتھ توہمات کی گرد نے حقیقت کو اس طرح ڈھانپ دیا کہ سچ کی روشنی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پھر انسان نے خود اپنے طور پر جب کبھی اس سوال کا جواب جاننے کی کوشش کی تو اس کے حصے میں سوائے اندھیروں کے کچھ نہیں آیا۔ انسان کی روحانی پیاس اسے مجبور کرتی رہی کہ وہ روحانیت کے چشمہ صافی سے خود کو سیراب کرے، مگر ہر دفعہ وہ توہمات کو روحانیت سمجھ کر شرک و اوہام کے سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ حالانکہ حقیقت ایک روشنی کی طرح پوری کائنات میں بکھری ہوئی تھی۔ پیغمبر انسانوں کو یہ سمجھاتے رہے کہ روشنی کو دیکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے

روشنی میں حقیقت کو دیکھنا سیکھو۔ خدا کو دیکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے نورِ خدا سے کائنات کو دیکھو گے تو ہر جگہ اس کی قدرت، ربوبیت کی نشانیوں اور اپنی فطرت میں اس کی زندہ تصویر پاؤ گے۔ یہی وہ بات ہے جسے سورہ نور میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

'اللہ ہی زمین و آسمان کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق ہو جس میں چراغ رکھا ہوا ہو، چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس ایسا ہو جیسے ایک چمکتا ہوا تارا۔ یہ چراغ زیتون کے ایسے شاداب درخت کے روغن سے جلایا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اُس کا روغن آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑکا پڑتا ہو۔ روشنی پر روشنی! اللہ اپنے نور کی طرف جس کی چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے۔ (یہ ایک تمثیل ہے) اور اللہ یہ تمثیلیں لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے بیان کرتا ہے۔ (وہ ہر ایک سے وہی معاملہ کرتا ہے جس کا وہ سزاوار ہے) اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔'' (النور 24:40)

اللہ آسمان و زمین کا نور ہے

اس آیت میں اصل دلیل ایک سادہ سے جملہ یعنی ''اللہ آسمان و زمین کا نور ہے'' ہے۔ یہ جملہ اپنے اندر ایک جہانِ معانی پوشیدہ رکھتا ہے۔ تاہم ان معانی کی وضاحت سے قبل یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس میں اللہ کو نور یا روشنی سے تشبیہ نہیں دی جا رہی۔ اللہ تعالیٰ ہر تشبیہ و تمثیل سے بلند ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں لیس کمثلہ شیئا یعنی ان جیسا کوئی نہیں۔ یہاں روشنی کا ذکر صرف اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے کہ ایک انسان اپنی نگاہ سے روشنی کو نہیں دیکھتا سکتا مگر روشنی وہ مظہر ہے جس کے ذریعے سے ہر چیز بالکل صاف اور جیسی وہ ہے اور جہاں ہے نظر آ جاتی ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کا ہے وہ خود نظر نہیں آتے نہ حواس ان کو گرفت میں لے سکتے ہیں، مگر ان کو ماننے کے بعد زمین و آسمان کی ہر چیز اپنی جگہ پر نظر آنے لگتی ہے۔ یعنی یہاں

مراد ایمان کی روشنی ہے کہ اللہ کو ماننے کے بعد کائنات کے ہر مظہر اور یہاں رونما ہونے والے ہر واقعے کی ٹھیک توجیہ ہو جاتی ہے۔اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ا)تخلیق و بقا کا سلسلہ

اس دنیا میں انسان کا سب سے بڑا مشاہدہ یہ ہے کہ یہاں ہر آن تخلیق کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ دھرتی گویا زندگی پیدا کرنے کا ایک کارخانہ ہے جہاں ہر شے یا تو تخلیقی عمل سے گزر رہی ہے یا پھر اس میں بالواسطہ طور شامل ہے۔مگر یہاں ہر شے اپنے وجود سے یہ گواہی دیتی ہے کہ یہ نہ خود وجود میں آسکتی ہے نہ خود باقی رہ سکتی ہے۔ ہر شے اپنے وجود کے لیے کسی دوسرے وجود کی محتاج ہے۔مثلاً ایک بچہ اپنے وجود کے لیے ماں باپ کا محتاج ہے۔ وجود میں آنے کے بعد زندگی کی بقا کے لیے بھی وہ ماں باپ یا ان کی غیر موجودگی میں کسی اور ایسی ہی طاقتور پناہ کا محتاج ہوتا ہے جو اس کی زندگی برقرار رکھ سکے۔ یہ ایک بچے کا نہیں زمین و آسمان کی ہر شے کا معاملہ ہے۔عقل کہتی ہے کہ کوئی نہ کوئی ہستی ہونی چاہیے جو پیدا بھی کرے اور بقا کی ضمانت بھی فراہم کرے۔ انسان اپنی عقل سے آج کے دن تک کسی ہستی کو نہیں تلاش کر سکا جو یہ کام کر رہی ہو۔مگر یہ سوال اپنی جگہ باقی ہے۔ چنانچہ یہی وہ بنیادی سوال ہے جس کا جواب قرآن کریم میں جگہ جگہ بیان کیا گیا ہے۔اختصار کے پیش نظر ہم صرف ایک مثال دے رہے ہیں۔

اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی ہر چیز پر نگہبان ہے، (الزمر 62:39)

یہی بات ایک سوال کی شکل میں یوں کہی گئی۔

''کیا یہ بغیر کسی خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا پھر یہ خود ہی خالق ہیں۔کیا انہی نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے۔''، (طور 52:35-36)

ہم نے جو بات اوپر بیان کی ہے بعض لوگ شاید یہ خیال کریں کہ یہ وہی دلیل ہے جسے فلسفے کی

اصطلاح میں دلیل علت casual argument یا پھر Cosmological Arguement کہا جاتا ہے۔علت کی دلیل کا مطلب ہے کہ دنیا کی ہر چیز کسی سبب یا علت سے وجود میں آئی ہے اور علت ومعلول کا یہ سلسلہ آخر میں خدا پر جا کر ختم ہوتا ہے۔تاہم قرآن مجید یہ نہیں کہہ رہا خدا تخلیقی عمل کی آخری کڑی ہے۔ بلکہ جیسا کہ اوپر بیان ہوا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر شے کا خالق ہے۔ایک بچہ بظاہر ماں باپ کے ذریعے سے پیدا ہوتا ہے، مگر اس کا خالق اللہ ہی ہے۔چنانچہ کائنات کی ہر شے بظاہر اسباب کے پردے سے ظہور پذیر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے، مگر اس کے پیچھے براہ راست اللہ کا اذن اور اس کی ربوبیت کام کررہی ہوتی ہے۔مطلب یہ کہ ہر شے براہ راست اللہ کے حکم سے تخلیق پاتی ہے۔ ہر شے کی تخلیق، اور تخلیقی نظام میں لاکھوں کروڑوں عوامل کام کررہے ہوتے ہیں۔ان میں سے ایک عامل بھی کم ہوجائے تو تخلیق کا عمل نہیں ہوسکے گا اور ہوچکا ہو تو فنا کے گھاٹ اتر جائے گا۔خلاصہ یہ کہ کائنات کی ہر شے براہ راست اللہ کی تخلیق ہے اور اپنے وجود کی بقا اور تسلسل کے لیے بھی یہ زمین وآسمان اللہ تعالیٰ ہی کے محتاج ہیں۔چنانچہ فرمایا:

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا ان کو تھامنے والا نہیں ہے۔بے شک اللہ بڑا حلیم اور درگزر فرمانے والا ہے۔''،(فاطر 41:35)

[جاری ہے]

پروفیسر محمد عقیل

پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے

اصول نمبر 9۔ اسٹاپ لاس (Stop Loss) کے قانون سے مدد لیں

کیس اسٹڈی:

لیو ٹالسٹائی کی خوش نصیبی تھی کہ وہ جس لڑکی سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا وہ اسے حاصل بھی ہوگئی اور دونوں کی شادی ہوگئی۔ لیکن وہ لڑکی انتہائی حاسد اور شکی مزاج نکلی۔ وہ بھیس بدل کر اکثر اپنے شوہر کا تعاقب کرتی، اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھتی اور شک کی بنا پر خودکشی کی دھمکی دیا کرتی تھی۔ ٹالسٹائی یہ بات جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ڈائری لکھنا شروع کی جس میں اس نے خود کو معصوم اور اپنی بیوی کو ہر قصور کا مورد الزام ٹھہرایا تاکہ آئندہ آنے والی نسلیں اسے معصوم سمجھیں۔ اس کی بیوی کو جب خبر ہوئی تو اس نے بھی اپنی ایک تصنیف میں ٹالسٹائی کو ایک گھریلو شیطان اور خود کو ایک شہید کے روپ میں پیش کیا تاکہ آئندہ کی نسلیں اسے اچھے الفاظ میں یاد رکھیں۔ دونوں آئندہ آنے والی نسلوں کے سامنے تو اپنی پوزیشن کلئیر کرنے میں لگے رہے لیکن انہیں یہ توفیق نہیں ہوئی کہ آپس میں مل بیٹھ کر ایک دوسرے کے سامنے اپنی پوزیشن کلئیر کریں۔ وہ اگر اسٹاپ لاس کا قانون اپلائی کرتے تو ان کی زندگی بہت خوشگوار ہوجاتی۔ وہ یہ تھا کہ جو ہوچکا سو ہوچکا، اب مزید نقصان نہیں اٹھانا۔

وضاحت

ہماری زندگی میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم نقصان اٹھاتے ہیں۔ کبھی غصے میں آکر کسی کو کچھ کہہ دیا، کبھی کوئی غلطی کرکے کسی کا دل دکھا دیا۔ کبھی یہ غلطی چھوٹی ہوتی ہے اور کبھی بڑی۔ لیکن یہ نقصان ہوچکا ہے۔ اب عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر اسٹاپ لاس کا اصول اپلائی کرکے مزید

غلطیوں اور نقصان سے بچا جائے۔ لیکن ہوتا عام طور پر اس کے برعکس ہے۔ ہم اس غلطی کو جسٹفائی کرنے کی کوشش میں نقصان در نقصان کئے جاتے ہیں۔ اور یوں نتیجہ بھیانک گمراہی اور ٹوٹل لاس کی شکل میں نکلتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کی نماز چھوٹ گئی ہے تو اسٹاپ لاس کا قانون یہ کہتا ہے کہ اس پر توبہ کرکے اس کی قضا پڑھ لی جائے اور آئندہ نماز نہ چھوڑی جائے۔ لیکن عام طور پر لوگ ایک نماز چھوڑنے کے بعد ہمت ہار جاتے اور مستقل بے نمازی بن جاتے ہیں۔ اسی طرح خاندانی جھگڑوں میں بعض اوقات یہ علم ہوتا ہے کہ ہم غلطی پر ہیں لیکن اسٹاپ لاس کرنے کی بجائے ہم غلطی کو جسٹفائی کرتے چلے جاتے ہیں جس سے تعلقات میں بحالی کی امید ختم ہو جاتی ہے۔

اسائنمنٹ

۔ان حقائق کی فہرست بنایئے جہاں آپ اسٹاپ لاس کا قانون اپلائی کرسکتے تھے اور آپ نے نہیں کیا۔

۔ان مستقبل کے مواقع کی فہرست بنایئے جہاں آئندہ آپ اسٹاپ لاس کا قانون اپلائی کرسکتے ہیں۔

حکمت یہ نہیں ہے کہ کسی بھی قیمت پر مسئلہ حل کیا جائے
حکمت یہ ہے کہ کم سے کم قیمت پر مسئلہ حل کیا جائے
(ابویحییٰ)

مبشر نذیر

ترکی کا سفر نامہ (9)

امیگریشن

جہاز ٹنل پر جا لگا۔ ہم لوگ یہاں سے نکل کر امیگریشن کاؤنٹر کی جانب بڑھے۔ اتنے میں ایک باحجاب خاتون تیزی سے ہماری جانب آئیں اور عربی میں کہنے لگیں، "سعودی حضرات امیگریشن سے پہلے ویزا کاؤنٹر سے ویزا لے لیں۔" سعودی شہریوں کے لئے ایئر پورٹ پر ہی ویزا کی سہولت موجود تھی۔ ہم لوگ امیگریشن کاؤنٹر کی جانب بڑھے۔ یہاں کثیر تعداد میں لوگ موجود تھے۔ اس وقت بہت سی فلائٹس اتری تھیں جس کی وجہ سے امیگریشن کی قطار بہت طویل تھی۔ یہ قطار آخر میں جا کر پندرہ بیس کاؤنٹرز پر ختم ہو رہی تھی۔ امیگریشن آفیسرز تیزی سے مہریں لگا کر لوگوں کو فارغ کر رہے تھے جس کے باعث قطار تیزی سے کھسک رہی تھی۔

قطار میں زیادہ تر لوگ یورپین تھے۔ ان میں سے پاکستانی صرف ہم ہی تھے۔ سابقہ تجربے کے باعث میرا خیال یہ تھا کہ جیسے ہی ہم امیگریشن کاؤنٹر پر پہنچیں گے، ہمارے سبز پاسپورٹ دیکھتے ہی امیگریشن آفیسر ہمیں کوئی نامی گرامی دہشت گرد یا اسمگلر سمجھتے ہوئے علیحدہ کمرے کی طرف بھیج دے گا۔ وہاں ترکش امیگریشن اور انٹیلی جنس کا عملہ ہم سے طویل تفتیش کرے گا اور مطمئن ہونے کے بعد ہماری جان چھوڑے گا۔ ہمارے سامان کی باریک بینی سے تلاشی لی جائے گی اور ہمارے جسم کے ریشے ریشے کو جدید مشینوں کی مدد سے چیک کیا جائے گا۔

میں نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے اپنے ذہن میں طویل منصوبہ بندی کر لی۔ اگر انہوں نے یہ سوال کیا تو اس کا جواب یہ ہو گا۔ اگر وہ پوچھا تو اس طرح جواب دوں گا۔ میں نے بیس پچیس سوالات کے ممکنہ جوابات تیار کر لیے۔ میں نے سوچا کہ اگر انہوں نے ترکی آمد کا

مقصد پوچھا تو کہوں گا کہ ترکی کے تاریخی مقامات پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔اس طرح شاید ان پر رعب پڑے اور وہ متاثر ہو کر جلدی جان چھوڑ دیں۔اس خیال کا اظہار میں نے اپنی اہلیہ سے کیا تو وہ فوراً بولیں: "یہ غضب نہ کیجیے گا۔آپ کسی طرف سے بھی کوئی مصنف یا محقق دکھائی نہیں دیتے۔"

انہوں نے میری شخصیت کا بے رحمانہ تجزیہ شروع کر دیا، "محققین کی تین نشانیاں ہیں: پہلی یہ کہ اس کی آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک ہونی چاہیے۔ وہ آپ لگاتے نہیں۔ دوسری نشانی یہ کہ محقق کو آدھے سر سے گنجا ہونا ضروری ہے۔ یا پھر کم از کم کنپٹیوں کے بال سفید ہونا ضروری ہے۔ ابھی آپ کے بال جھڑنا شروع نہیں ہوئے اور نہ ہی سفید ہوئے ہیں۔ تیسری نشانی یہ کہ محقق کی توند کا باہر نکلا ہوا ہونا ضروری ہے جس کا ڈایا میٹر کم از کم 48 انچ ہو۔آپ کی اچھی بھلی توند نکلی ہوئی تھی جسے آپ نے اسکواش کھیل کھیل کر اور فاقے کر کر کے اندر کر لیا۔اب اگر آپ ایسا کوئی دعویٰ کریں گے تو امیگریشن والے ہمیں مشکوک سمجھیں گے۔"

اس تجزیے نے مجھے کافی حد تک قائل کر لیا تھا اور ایسا کوئی دعوی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔حقیقت یہی ہے کہ انسان کو خود کو صرف اور صرف طالب علم سمجھنا چاہیے۔ جب کوئی طالب علم خود کو محقق، مدقق، اسکالر، عالم اور اس طرح کے بھاری بھرکم القابات سے مزین کرنے لگتا ہے تو ابتدا میں اس کی گردن اکڑنے لگتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوسروں کو جاہل سمجھ کر انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔اس کے بعد اس کا علم اسے جاہل بنا دیتا ہے۔ یہ لاعلمی والی جہالت نہیں ہوتی بلکہ رویے کی جہالت ہوتی ہے جو انسان کو سرکش بنا دیتی ہے۔ دور جاہلیت کے ایک شاعر عمرو بن کلثوم کے بقول ؎

الا لا یجھلن احد علینا............فنجھل فوق جھل الجاھلینا

خبردار! کوئی ہمارے خلاف جہالت کا اظہار نہ کرے کہ ہم بھی تمام جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

ایسا جاہل واقفیت کے باوجود متکبرانہ رویے کے باعث کسی کی بات نہیں سنتا۔ خود کو ہمیشہ حق پر سمجھتا ہے اور اپنے مخالف کو کافر، فاسق اور فاجر کا خطاب دیتا ہے۔ یہی وہ جہالت پر مبنی رویہ ہے جس کے حاملین سے اگر سامنا ہو تو الجھنے کی بجائے "قَالُوا سَلاماً" کہہ کر رخصت ہو جانے کی ہدایت قرآن مجید نے کی ہے۔ یہ علم بڑی عجیب چیز ہے۔ اس کی طلب میں رہو تو یہ اپنے پیچھے لگا کر انسان کو خدا کی بادشاہی یعنی جنت میں داخل کر دیتا ہے اور اگر اپنے تیئں اس کے علم بردار بن جاؤ تو یہ جہنم کی گہرائیوں میں جا گراتا ہے۔

امیگریشن والوں کو مطمئن کرنے کی منصوبہ بندی کرتے ہم کاؤنٹر پر جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر میری ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ گئی کیونکہ امیگریشن آفیسر نے فٹا فٹ مہریں لگا کر ہمیں مسکرا کر دیکھا اور ویلکم کیا۔ امیگریشن سے جلدی جان چھوٹ جانے کی وجہ سے مجھے کافی مایوسی ہوئی کیونکہ میں دوسرے سفرنامہ نگاروں کی طرح قارئین کو اس کی الم ناک داستان سنانے سے محروم ہو گیا تھا۔

اب بیلٹ سے سامان اٹھانے کا مرحلہ تھا۔ لاؤنج ہر قومیت کے لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ترکی ایک ٹورسٹ ڈیسٹی نیشن ہے۔ یہاں یورپ، امریکہ اور مشرق وسطیٰ سے کثیر تعداد میں سیاح آتے ہیں۔ یہ سیاح اس ملک کے ہوٹلوں میں رہتے ہیں جس سے ہوٹل کے مالکان، اسٹاف، ویٹر اور صفائی کرنے والوں کا روزگار چلتا ہے۔ یہی سیاح کرائے پر گاڑیاں اور ٹیکسیاں لیتے ہیں تو ان کی روزی روٹی کا بندوبست ہوتا ہے۔ تاریخی مقامات پر یہی سیاح ترکی کی حکومت کو فیس ادا کرتے ہیں جس سے ان کے ملک کی ترقی کے لئے وسائل فراہم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

یہاں سیاحوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔

سیاحت کو فروغ دینا یقیناً ملک کی معیشت کے لئے بہت اچھا ہوتا ہے کیونکہ اس سے لوگوں کو روزگار نصیب ہوتا ہے۔ ہر ملک اپنے قدرتی حسن، تاریخی مقامات اور کلچرل کشش کو پوری دنیا میں مارکیٹ کرتا ہے۔

تھائی لینڈ نے سیاحت کو فروغ دینے کے لئے ایک عجیب طریقہ اختیار کیا۔ ان کے بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ ہر گھر اپنی ایک لڑکی کو جسم فروشی کے لئے وقف کر دے تاکہ سیاح تھائی لینڈ کا رخ کریں۔ یہاں کے لوگ بادشاہ کو دیوتا سمجھ کر اسے پوجتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک تو کیا، کئی لڑکیوں بلکہ لڑکوں تک کو اس مذموم مقصد کے لئے وقف کر دیا۔

تھائی لینڈ میں قدرتی حسن اور تاریخی مقامات کی سیاحت کی بجائے پوری دنیا سے جنسی مریض آنے لگے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایڈز اور دیگر بیماریاں لے کر آئے۔ تھائی قوم جو دنیا میں ایک محنتی قوم سمجھی جاتی تھی، جنسی مریضوں کی غلام بن کر رہ گئی جس کے نتیجے میں آج یہ ایڈز کا شکار ملک ہے، ان کا خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے اور پورا معاشرہ تباہی کی طرف گامزن ہے۔ حال ہی میں دبئی کو سیکس ٹورازم کے لئے مارکیٹ کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب دبئی ایک بہت بڑے قحبہ خانے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ اگر یہاں کے باشندوں نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو اس ملک کا انجام بھی تھائی لینڈ جیسا ہی ہو گا۔

میں سامان والی ٹرالی لینے گیا تو عجیب صورت حال پیش آئی۔ ٹرالیاں ایک زنجیر کے ذریعے جکڑی ہوئی تھیں اور یہ زنجیر ہر ٹرالی پر موجود ایک آٹو میٹک تالے سے گزر رہی تھی۔ یہاں کچھ یورپی سیاح سکے ڈال کر ٹرالی حاصل کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ٹرالی کے لئے ایک لیرا (اس وقت کے پچاس پاکستانی روپے) کا سکہ ٹرالی کے تالے میں ڈالنا ضروری ہے۔ یہ ترک تو بڑے

کاروباری نکلے۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں یہ سہولت بلا معاوضہ ہوا کرتی ہے لیکن یہاں اس کا بھی کرایہ لیا جارہا تھا۔

قریب موجود ایک کاؤنٹر سے پانچ لیرے کے نوٹ کے بدلے سکے حاصل کیے۔ مجھے خطرہ لگا رہا کہ اس معاملے میں بھی وہ کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پانچ لیرے کے بدلے چار لیرے دے دیں گے مگر انہوں نے پورے پانچ ہی دیے۔ ٹرالی لے کر ہم نے بیلٹ سے اپنا بیگ اٹھایا۔ اب امیگریشن کاؤنٹر سامنے تھا۔ یہاں بھی حیرت انگیز طور پر انہوں نے کوئی تعرض نہ کیا اور ویلکم ٹو ترکی کہہ کر ہمیں باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہم ایئرپورٹ سے باہر آ گئے۔

[جاری ہے]

جو لوگ ایمان اور اخلاق کی راہ پر چلتے ہیں
جنت خود ہی ان کی منزل بن جاتی ہے اور
جو لوگ خواہش اور تعصب کی راہ پر چلتے ہیں
جہنم خود بخود ان کی منزل بن جاتی ہے
(ابویحییٰ)

ابو یحییٰ کی نئی تصنیف

''حدیثِ دل''

زندگی اور شخصیت کی تعمیر کے لیے رہنما تحریریں
جو دل سے لکھی گئیں اور دل والوں کے لیے لکھی گئیں

''تیسری روشنی''

(مصنف: ابو یحییٰ)

☆ ابو یحییٰ کی داستان حیات ۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابو یحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

(مزید معلومات کے لیے رابطہ: 0332-3051201)

توکل

❁ حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا کہ: تم لوگ اگر اللہ پر ٹھیک سے توکل کرو، تو وہ تمھیں اس طرح روزی دے گا، جیسے کہ وہ چڑیوں کو روزی دیتا ہے۔ وہ صبح کو جب روزی کی تلاش میں گھونسلوں سے روانہ ہوتی ہیں تو ان کے پیٹ پچکے ہوئے ہوتے ہیں اور شام کو جب وہ اپنے گھونسلوں میں آتی ہیں تو ان کے پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ (ترمذی۔ بحوالہ راہ عمل)

❁ حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: آدمی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اس کے لیے فیصلہ کرے، اس سے راضی ہو، اس پر قناعت کرے اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ سے خیر اور بھلائی کی دعا نہ کرے، اور آدمی کی بدنصیبی یہ ہے کہ اللہ کے حکم اور فیصلے پر ناراض ہو۔ (ترمذی۔ بحوالہ راہ عمل)

❁ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ! میں اپنی اونٹنی کو باندھوں اور اللہ پر توکل کروں، یا اسے چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ آپؐ نے فرمایا: پہلے تم اسے باندھو پھر توکل کرو۔ (ترمذی۔ بحوالہ راہ عمل)

❁ حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ آدمی کا دل ہر وادی میں بھٹکتا رہتا ہے، تو جو شخص اپنے دل کو وادیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے گا تو اللہ کو پروا نہ ہوگی کہ اسے کون سی وادی تباہ کرتی ہے، اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے ان وادیوں اور راستوں میں بھٹکنے اور تباہ ہونے سے بچائے گا۔ (مشکوۃ، ابن ماجہ۔ بحوالہ راہ عمل)